عزیز ملک

اقبالؒ اور ملّی استقلال

جنابِ عزیز ملک راولپنڈی کے ممتاز اور صاحبِ طرز ادیب اور مورخ کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ کا یہ مقالہ "مجلسِ اقبال راولپنڈی کے ایک ماہانہ تنقیدی اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔

مولانا حالی لکھتے ہیں :

"اشغالِ دنیاوی میں انہماک کے سبب سے جو قوتیں سو جاتی ہیں۔ شعر انہیں بیدار کرتا ہے ـــــــ"

شعر سے متعلق اس توجیہہ کو اگر صحیح مان لیں تو اس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ مرحوم کے کلام کا جائزہ لینا آسان ہو جائے گا کہ انہوں نے کس طریق پر شعر کو اپنے انقلاب آفریں پیام کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ انہیں اپنے نام کے ساتھ شاعرِ انقلاب لکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ان کے مختلف ادوار کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالیں تو اس میں مشرق و مغرب کے ذوق تفلسف کے حسین امتزاج تلمیحات۔ خودی کا فلسفہ، جنون و عقل کی دست و گریبانی، تصوف نزاکتِ تخیل، رنگینی، شعریت پیام اور قدم قدم پر لطیف اشاریت کا اہتمام ملتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے شعر سے وہ کام لیا جو بظاہر نغمہ و آہنگ سے اس دَور میں لیا نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ پورا مسلم معاشرہ موت کی آغوش میں رینگ رہا تھا۔ غزل کی روایت میں طوائف کے گلے کا لوچ اور مقرکتے جسموں کی رعنائی لرزاں تھی اور شعر کے جام میں دو آتشہ کی وہ کشید چھلک رہی تھی جو زندگی کے جُرعۂ تلخ کے ساتھ گزک کا کام دیتی ہے۔ اک طرف اودھ کی اندوہگین شام کا منظر تھا۔ جس کے اندھیارے پھیل کر ماتم خانوں کی سیاہی میں ڈھل چکے تھے۔ دوسری جانب بنارس کے افق پر نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جس کے مقدر میں مغرب کی پہنائیوں سے اُبھرتے سورج کا اُجالا بھی شامل تھا۔ ماحول بڑا پُر آشوب تھا۔ جسم رہنِ غلامی رُوحیں زخمی اور سہمی سہمی۔ مکتب جرأتِ رندانہ سے محروم۔ مسجدیں ویران۔ صفیں کج، دل شکستہ اور خانقاہیں عظمتِ ماضی کے خوابوں میں جھلملا رہی تھیں۔

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوۂ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
وہ سجدہ رُوحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

یہ تھی آس پاس کی کائنات جب حکیم اُمت نے اپنے تاسیسی، تعمیری اور تجدیدی کام کا آغاز کیا اور شعر کو اپنے حیات آفریں پیام کا ذریعہ بنایا، کیونکہ یہی سکّہ ان دنوں بازارِ سخن میں عام تھا اور شعر کی لطافت میں ویسے بھی کانوں کی راہ سے اتر کر دل میں تیر جانے والا جادو پنہاں ہوتا ہے۔ حکیم اُمت کے لئے یہ ذریعۂ انتخاب کچھ نامناسب نہ تھا۔ لیکن جب سطح بیں نگاہوں نے انہیں بھی شاعرِ محض گردانا تو ان کی یہ فریاد بے محل نہ تھی ؎

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

بالآخر ملت نے ان کے پیام کی رُوح اور تعمیری فکر کے اس رُخ کو پالیا۔ جو ان کے شعر میں مضمر تھا۔

ہمارے شعر و ادب میں یہ معجزہ صرف اقبالؒ کا حصّہ ہے کہ اس نے سخن آفرینی کی عام روش سے ہٹ کر مشکل اور بھاری بھر کم الفاظ کے انتخاب کے باوصف شعر کو نغمے کا آہنگ بخشا۔ لیکن یہ نغمہ رباب و چنگ کی ضیافت کا سامان نہ تھا بلکہ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبالؒ کے دل کش اشعار کی معنوی قدر و قیمت کے علاوہ شعر گوئی کی بھرپور فطری قوت کے لحاظ سے بھی دنیائے شعر میں بیدلؔ، مرزا غالبؔ اور غنی کشمیری کے نگار خانوں میں شروع سے آخر تک یہ اُفتاد موجود ہے کہ وہ جب پر پرواز کھولتے ہیں تو تخیّل کی اڑان میں مہر و انجم سے بھی اُوپر نکل جاتے ہیں لیکن زمینِ شعر پر اُترتے اُترتے الفاظ پر انہیں قابو نہیں رہتا۔ یہ سانحہ قریب قریب ہر اس بلند خیال جوہرِ قابل پر گذر جاتا ہے۔ جو بادلوں کو چیر کر نکلتا ہے۔ لیکن نزاکت آفرینی کے جنون میں مشکل پسندی یا

اہمال کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہی حال خیال بندوں کے اس طائفے کا ہے جنہیں حرفِ عام میں غزل گو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کا سرمایۂ فکر و نظر گنتی کے چند اچھے اشعار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ اس اہمال بھی اُن سے چھن جائے تو ان کی ہنگامی شہرت کا کشکول بقائے دوام کے عنصر سے یکسر خالی نظر آنے لگتا ہے ——— لیکن اقبال اس مفلسی کا شکار نہیں کیونکہ جب تک اس کا انقلاب آفرین پیام زندہ ہے بلکہ یوں کہیے جب تک اسلام باقی ہے اس کی برتری کا پھریرا بلندیوں پہ لہراتا رہے گا۔

بیان میں جادو اور شعر و ادب میں حکمت کا ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ چند مؤثر الفاظ کی بندش جہاں دیدہ و دل کی کائنات اور وجدان میں کیف اور وارفتگی کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ وہاں اس میں یہ طلسم بھی موجود ہونا چاہیئے کہ ذہن و فکر کے زاویے بدل کر کائناتِ ہفت رنگ کی بساطِ کہن کو اُلٹ کر رکھ دے۔

کہتے ہیں ایک محفل جس میں کارلائل بھی شریک تھا۔ کسی نے بر سبیل تذکرہ کہا کہ اجتماع و معاشرت کے انقلابات دل خوش کن تصوّر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ سُن کر کارلائل نے غضب ناک ہو کر سامعین سے کہا۔" صاحبو! ایک شخص گزرا ہے جس کا نام روسو تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی اور لوگوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔ لیکن بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی پشت بندی کے لیئے اُنہی ہنسنے والوں کے بدن کی کھال کھینچی جا رہی تھی۔"

اقبال کی قلندرانہ فاش گوئی پہ کسی مسخرے کو آج تک ہنسنے کی جراُت تو نہیں ہوئی، لیکن یہ حادثہ بھی کچھ کم افسوس ناک نہیں کہ حسُن کی منڈیوں میں اقبال کے کلام سے ذہنی تعیش کا کام لیا جانے لگا۔ نوا کاروں اور کلاونتوں نے اس کو سامعین کے حسُنِ مذاق سے اپنے آرٹ کے دام وصول کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اگر اقبال کا کلام اسی تفریحی مفہوم سے عبارت ہے تو ع

مرا بر آرزو ہائے نظیری خندہ می آید

خود حضرت علامہ کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کے اشعار کے بطن میں جو معانی پنہاں ہیں۔ ان کے فہم سے اس کم نصیب ملّت کا شعور عاری ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
او حدیثِ دلبری خواہد ز من
رنگ و آب شاعری خواہد ز من

انہیں معلوم تھا کہ حدیثِ دلبری قوم کی اجتماعی زندگی کے لئے موت ہے اور اس تعمیری منصوبے کے بھی منافی ہے جو انہوں نے قوم کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے تیار کیا ہے۔ چنانچہ اسی نظم میں آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

من ز شکوہ خسروی او را دہم
تختِ کسریٰ زیر پائے او نہم

اس شعر سے جو ٹیس اُٹھ رہی ہے وہ ان کے انقلابی جذبے کی اساس ہے اور اس منصوبے کی غمّاز ہے جس کے تحت وہ اپنے کام کو کامیابی کی منزل تک لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس مہم کو سر کرنے کے لئے جس مناسب فضا اور آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے وہ برِّصغیر کے مسلمانوں میں تقریباً مفقود تھی۔ مسلمان زندہ در گور تھے۔ اسلام کتاب میں بند تھا اور کتاب طاقِ نسیان پر ریشمی غلافوں کے اندر لپٹی پڑی تھی۔ اجتماعیت نام کو نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے جب ؏

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

مسلمانوں کے اس دَورِ انحطاط کی دل خراش داستان کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

مُسلمِ ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

یعنی وہ ملّت جو کفر زارِ ہندوستان میں فتح مندانہ داخل ہوئی، چند صدیوں کے طمطراق کے بعد زبوں حالی اور شکست کے قعرِ عمیق میں دھنس گئی۔ دنیاوی اعتبار سے ہی غضبِ الٰہی کا شکار نہ ہوئی، بلکہ معاشی، معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے بھی اس کا ہر خانہ الٹ کر رہ گیا۔ ملّتِ اسلامیہ جو خدائے واحد کی پرستار تھی۔ اپنے مقام سے گر گئی اور لاتعداد اعتقادی گروہوں کے پُرپیچ مفہوم کی آئینہ دار بن گئی۔ اس کا اب کوئی راستہ متعین تھا نہ کوئی راہ نما۔ اجتماعی نظم تھا نہ انفرادی ربط ہی قائم۔ یہ سب پٹے ہوئے مہرے تھے یا کسی دیوانے کی تماشہ گاہ کے بکھرے ہوئے کھلونے۔ یہ سب کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضاؤں کی خلا

درخلا وسعتوں میں لڑھکتے پھر رہے تھے ۔ اخلاق باختگی اور افلاس کے بحرِ بے پایاں میں بلا ارادہ وشعور اِدھر سے اُدھر سرک جانے والی گندی مچھلیاں تھیں جو نہنگوں کا شکار بن چکی تھیں ۔ یہ کہکشاں کی گذرگاہ پر رینگنے والے اُن بجھے ہوئے ستاروں کی راکھ تھے ۔ جنھیں وقت کی رو اِک دن بہالے جانے والی تھی ۔

اُس وقت صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی تحریکیں اُٹھیں اور فنا کی نیند سو گئیں ۔ کئی لیڈر پیدا ہوئے اور مر گئے ۔ اولادِ ابراہیم کو نمرود کے امتحانوں کی کتنی ہی بھٹیوں سے گذرنا پڑا ۔ تہذیبِ مغرب کا سیلاب امڈتا آیا ۔ مسلمان تباہی کے دوش پہ اُڑتے چلے گئے ۔ اقتصادی بدحالی ہی نہیں سیاسی لحاظ سے بھی وہ ہر لحظہ زبوں ہوتے گئے ۔ اخلاقی قدریں ایک ایک کر کے مٹتی چلی گئیں ۔ یہ کیفیت جو گذشتہ کئی صدیوں کے انحطاط کا منطقی نتیجہ تھی ۔ اب پوری شدت کے ساتھ مسلم معاشرے کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی ۔ ملت کا شکستہ سفینہ ہلاکت خیز موجوں کے تُند دھارے پر بہے چلے جا رہا تھا ۔ ساحل ناپید ، ناخدا گم —— لیکن ہجوم یاس کی تاریکیوں میں ہاتف نے لا تَقْنَطُوْا کا مُژدہ سنایا ۔ اور سوتوں کی بستی میں ایک آواز بلند ہوئی ۔ جس نے جمود کو توڑا ، اور ساحلِ مراد کی سمت راہ نمائی کی ؎

بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگاہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

اس طرح حکیم امت نے ملّت کے سیاسی استقلال کے لئے شعر کی نفیری میں نغمہ و نالہ کا سانس پھونکا ۔ اُن کی نظر اسلام کی تقدیر پر تھی ۔ ایسی تقدیر جسے خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زبان تو ہے کہا گیا ہے اور جس کی استفہامی نظر کا تار اس مصرعہ پر ٹوٹتا ہے ؏

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم نے ملّی استقلال کے لئے واقعی کوئی تعمیری منصوبہ تیار کیا ۔ یا وہ صرف قافیہ پیما شعر طراز فلسفی تھے ۔ جنھوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے یہ شغل اختیار کر لیا تھا کہ ملت کو اُن کے ماضی کی رنگین داستان سنا کر محظوظ کریں یا ان کے پاس دردِ ملّت کا کوئی مداوا بھی تھا ؟

بین الاقوامی حالات پر نظر رکھنے والے احباب سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد جب اسلامیانِ مشرق نے صدیوں کے بعد جمود کو توڑنے کا آغاز کیا ہے تو گرد و پیش کی دنیا میں ایک برقی انقلاب بپا دیکھا۔ تبدیلی کی یہ رَو بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اسی تغیّر کے متعلق علامہ اقبال اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ "اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اُس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"

اس احساس کی روشنی میں علامہ نے سوچا کہ اس کائنات میں مسلمانوں بالخصوص بّرِصغیر کے مسلمانوں کے لئے آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے امکانات پیدا ہونے چاہئیں۔ چونکہ اندرونِ ملک اس صبحِ اُمید کو نزدیک تر لانے کے اسباب مہیّا نہ تھے۔ ان کی بیقرار طبیعت نے بالآخر ایک راستہ ڈھونڈھ نکالا، اور ان کی نگاہِ انتخاب شاہِ افغانستان غازی امان اللہ خان پر پڑی کہ وہ قوّت پیدا کر کے ہندوستان پر حملہ کرے۔

افغانستان ۱۹۲۱ء میں انگریزی کی بالادستی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ لیکن اُس کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ یوں بھی اس کی آبادی بہت مختصر یعنی سوا کروڑ کے قریب تھی اور اُس میں انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے وسائل کی کمی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے استخلاص کے لئے اس کو ہندوستان پر حملے کی ترغیب دلانا بظاہر بہت تعجب انگیز سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن علاّمہ مرحوم یہ جانتے تھے کہ مشکلات و موانع کے باوجود اگر یہ تجویز امان اللہ خان کی سمجھ میں آ گئی تو ہواؤں کا رُخ بدل جائے گا۔

یہ منصوبہ کسی خُفیہ سازش کے تحت امان اللہ خان تک نہیں پہنچایا گیا بلکہ پیامِ مشرق کے ابتدائیہ میں کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اِس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:-

تازہ کُن آئینِ صدیقؓ و عُمرؓ
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر
جانِ تو بر محنتِ پیہم صبُور
کوششں در تہذیبِ افغانِ غیور

وشنہ زن در پیکرِ ایں کائنات
در شکم دارد گہر چوں سومنات
لعلِ ناب اندر بدخشانِ تو ہست
برقِ سینا در قہستانِ تو ہست
خیزو اندر گردش آور جام عشق
در قہستاں تازہ کُن پیغامِ عشق

بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم اُمت کے اشارے کو شاہ افغانستان نے کما حقہٗ پا لیا اور منزل پر پہنچنے کے لئے گامزن ہوگیا۔ لیکن فرنگی نے امان اللہ خان کا تخت ہی الٹوا کر رکھ دیا اور بات بنتے بنتے رہ گئی۔

تاہم اقبال اس پر تھک کر نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے سوچا ؎

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ویسے تو انہوں نے ۱۳ء کے لگ بھگ اپنے تعمیری منصوبے کا آغاز فرمایا تھا۔ "شمع و شاعر" میں جو انہی دنوں لکھی گئی، تنظیمِ ملت کے واضح اشارے ملتے ہیں اور قومی درد کا احساس بھی موجود ہے، رقت بھی ہے، سوز بھی اور راہِ منزل کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ آگے چل کر "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" کے اشعار میں بھی اسی پیغام کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے۔ پھر یہ دَور اُردو سے گزر کر فارسی شعر گوئی تک پہنچتا ہے۔ "اسرار و رموز" میں جذباتی رنگ کسی قدر کم ہوگیا ہے تاہم وہ بھی اسی سلسلے کی ارتقائی کڑی ہے جس میں تعمیری اور تاسیسی مقاصد بڑی سنجیدگی سے دہرائے گئے ہیں۔ فلسفۂ خودی کے بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اسرار و رموز کے نثری دیباچے میں فرماتے ہیں (یہ دیباچہ طبع اوّل میں موجود تھا۔ لیکن بعد کی اشاعتوں سے خارج کر دیا گیا)

"حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تا کہ ان کے انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوّتِ حافظہ سے

اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملّیہ کے لئے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کرکے "قومی انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدّنظر رکھ کر میں نے ملّتِ اسلامیہ کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اِسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیئت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اصول کیا ہیں۔"

اس اقتباس کے آخری فقرے میں جس عملی اصول کا اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس کی تشریح ہمیں بعد کی تصانیف سے ملتی ہے۔ ؎

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

اس تعمیر کا راز ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کی بیداری اور اُن کے عالمگیر جذبۂ اخوت اور حیاتِ نَو کی تعمیر ہے بلکہ ان کے لئے دُنیا بھر کی امامت کا راستہ ہموار کر رہی ہے ؎

اگر آگاہی از کیف و کم خویش
یمے تعمیر کن از شبنم خویش

"پیامِ مشرق" کے دیباچے سے چند سطور نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن مجید نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدّنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

اسلامی مشرق سے ان کا تخاطب محض برائے وزنِ بیت نہ تھا بلکہ وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ پوری ملّت اسلامیہ کو دعوتِ عمل دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ و شامِ خویش را

حکیم اُمت کی مجوزانہ اور مفکرانہ حیثیت سے قطع نظر قومی استقلال کے لیے سیاسی میدان میں ان کی تگ و دو کا بھی سراغ ملتا ہے اگرچہ سیاسیات میں اُلجھنا ان کا مطمعِ نظر نہ تھا تاہم سیاست کے چراغ کو بھی ان کے فکر کا خون ملا ہے چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں پاکستان کا نظریہ پیش کیا ان کے الہامی لہجے میں ایک حسین خواب کی عملی تفسیر نظر آرہی ہے کہ

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ ام
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گذشت
ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما

"کافرستان" میں بنیادِ حرم یعنی نظریۂ پاکستان ابتداء میں بظاہر کتنا ہی عجیب و غریب نظر آیا تاہم دس برس کے اندر اندر یہ نعرہ برصغیر کے طول و عرض میں بسنے والے تمام مسلمانوں کی زبانوں پر تھا اور اس انداز سے پاکستان کا قیام انگریز کی داد و دہش کا محتاج تھا اور نہ ہندو کی فراخ دلی کا منتظر بلکہ مسلمان کی مرضی اور منشا کا سوال بن کر رہ گیا۔

اب اگر ماضی کے دھندلے نقوش میں ان راہ گزاروں کا سراغ لگاتے ہیں۔ جن پر حکیم امت نے اسلامی فکر اور تعمیر نو کی مشعلیں روشن کیں تو ہمیں قدم قدم پر ان موانع اور مشکلات کا احساس ہوتا ہے جو راہِ طلب میں حائل رہیں۔ راہرو چلا اور ایک مقام تک پہنچ گیا اگرچہ فاصلے ابھی طے نہیں ہوئے اور حکیم اُمت کے پیغام کی راہنمائی اپنے مقصد کی تکمیل سے ہنوز فارغ نہیں ہوئی لیکن اب بھی اس کی روح ستاروں کی اوٹ سے یہ سرمدی نغمہ سنا رہی ہے۔ ؎

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی